ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 3953

Program: BS Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ (شعبہ سیرت سٹڈیز)

کورس: مطالعہ قرآن حکیم ترجمہ تفسیر (3953) • سطح: بی ایس علوم اسلامیہ

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 1 ریونٹ نمبر 1 تا 5)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 0

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق، فرشتوں سے مکالمہ اور انسان کا مقام و فضیلت (20 نمبر)

سوال نمبر 1۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور فرشتوں کے ساتھ ہونے والے مکالمے کی روشنی میں انسان کے مقام و فضیلت پر تفصیلی گفتگو کریں۔ (20)

تعارف

قرآن حکیم نے انسان کی تخلیق کا ذکر محض ایک تاریخی واقعے کے طور پر نہیں کیا بلکہ اس کے ذریعے انسان کو اس کا اصل مقام، اس کی ذمہ داری اور کائنات میں اس کا کردار سمجھایا ہے۔ سورۃ البقرہ کے آغاز میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق، فرشتوں کے ساتھ مکالمے، اسماء کی تعلیم اور فرشتوں کے سجدے کا واقعہ اسی لیے بیان ہوا ہے کہ انسان اپنی قدر و قیمت پہچانے اور زمین پر اللہ کے نائب (خلیفہ) کی حیثیت سے زندگی گزارے۔ یہ واقعہ انسانی عظمت کے ساتھ ساتھ انسانی ذمہ داری کی سب سے پہلی اور بنیادی دستاویز ہے۔ مطالعہ قرآن کے طالب علم کے لیے اس واقعے کو اسی زاویے سے سمجھنا ضروری ہے کہ قرآن کا مقصد قصہ گوئی نہیں بلکہ ہدایت ہے، چنانچہ ہر واقعہ اپنے اندر زندگی کے اصول رکھتا ہے۔ اس جواب میں پہلے واقعے کا خلاصہ، پھر مکالمے کے اہم نکات اور آخر میں انسان کے مقام و فضیلت کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی جائے گی تاکہ سوال کے تمام تقاضے پورے ہو سکیں۔

واقعے کا خلاصہ: سورۃ البقرہ کی روشنی میں

سورۃ البقرہ (آیات 30 تا 39) میں بیان کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو خبر دی کہ وہ زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہے۔ فرشتوں نے عرض کیا کہ کیا آپ زمین میں ایسا وجود رکھیں گے جو فساد کرے اور خون بہائے، حالانکہ ہم آپ کی تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ اس کے بعد آدم علیہ السلام کو تمام اسماء (چیزوں کے ناموں اور ان کے حقائق) کا علم سکھایا گیا، پھر فرشتوں سے کہا گیا کہ اگر تم سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ فرشتوں نے عاجزی سے اعتراف کیا کہ ہمیں صرف اتنا ہی علم ہے جتنا آپ نے ہمیں سکھایا ہے۔ پھر آدم علیہ السلام نے وہ اسماء بیان کر دیے تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو، چنانچہ سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے جس نے انکار اور تکبر کیا۔ اس کے بعد آدم علیہ السلام اور ان کی زوجہ کو جنت میں رہنے اور شجرِ ممنوعہ سے بچنے کا حکم ہوا، لیکن شیطان کے بہکاوے سے لغزش ہوئی، توبہ قبول ہوئی اور انسان کو زمین پر بھیج کر ہدایت پر چلنے کی زندگی کا پروگرام عطا فرما دیا گیا۔ یہی خلاصہ اس مکالمے کی بنیاد ہے۔

فرشتوں کے سوال کا مفہوم اور اس کا جواب

مفسرین نے واضح کیا ہے کہ فرشتوں کا سوال اعتراض نہیں تھا بلکہ استفسار تھا، یعنی وہ تخلیق انسان کی حکمت جاننا چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے منشا پر اعتراض فرشتوں کی شان کے خلاف ہے کیونکہ وہ اللہ کے فرمانبردار بندے ہیں، جو حکم دیا جاتا ہے وہی کرتے ہیں۔ فرشتوں نے اپنی بات انسانی فساد اور خون ریزی کے امکان کی بنیاد پر کہی تھی جو ان کے مشاہدے یا اللہ کے عطا کردہ محدود علم سے متعلق تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے سوال کا جواب انکار سے نہیں دیا بلکہ عملی مظاہرے سے دیا: اسماء کی تعلیم کے ذریعے یہ ثابت کر دیا کہ انسان کے اندر وہ علمی استعداد رکھی گئی ہے جو اسے زمین کی تعمیر و اصلاح کے قابل بناتی ہے۔ اس جواب سے یہ اصول بھی ملتا ہے کہ کسی چیز کی حقیقی قدر اس کی ظاہری کمزوری سے نہیں بلکہ اس کے اندر رکھی گئی صلاحیت اور مقصد سے متعین ہوتی ہے۔ انسان کے اندر فساد کی صلاحیت بھی ہے اور اصلاح کی بھی، فیصلہ کن چیز اس کی آزادی اور علم کا درست استعمال ہے۔

خلافت: انسان کا سب سے بڑا شرف

انسان کے مقام کا پہلا اور نمایاں پہلو خلافت ہے۔ قرآن نے انسان کو زمین میں خلیفہ قرار دیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان زمین پر اپنے من سے نہیں بلکہ مالکِ حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تحت تصرف کا ذمہ دار ہے۔ خلافت کا مفہوم ملکیت نہیں بلکہ امانت اور نیابت ہے۔ زمین، اس کے وسائل، جانور، پانی، جنگلات اور معدنیات انسان کی ذاتی جاگیر نہیں بلکہ امانت ہیں جن کا حساب دینا ہو گا۔ خلیفہ کا کام زمین کو آباد کرنا، عدل قائم کرنا، مخلوق کی خدمت کرنا اور فساد سے روکنا ہے۔ جب انسان خلافت کا یہ مفہوم بھول کر خود کو مطلق مالک سمجھ بیٹھتا ہے تو ظلم، استحصال اور ماحولیاتی تباہی جنم لیتی ہے۔ اس کے برعکس جب وہ اپنے آپ کو امین سمجھتا ہے تو اس کی سیاست، معیشت اور تمدن میں توازن آتا ہے۔ گویا خلافت انسان کی عزت بھی ہے اور اس کا امتحان بھی، کیونکہ منصب جتنا بلند ہو ذمہ داری اتنی ہی بھاری ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے امانت کی پیشکش اور انسان کے اسے اٹھانے کا ذکر بھی کیا ہے (سورۃ الاحزاب، آیت 72 کا مفہوم) تاکہ انسان اس بوجھ کی سنگینی کو محسوس کرے۔

علم: انسان کی فضیلت کی بنیاد

مکالمے سے انسان کی فضیلت کا دوسرا بڑا پہلو علم ہے۔ آدم علیہ السلام کو اسماء کی تعلیم دی گئی، اور اسی علم کی بنیاد پر فرشتوں کے سامنے ان کی برتری ظاہر ہوئی۔ اسماء کے علم سے مراد چیزوں کو پہچاننے، ان کے نام رکھنے، ان کی خصوصیات سمجھنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت ہے۔ یہی صلاحیت انسان کی تمام ترقی کی جڑ ہے: زبان، سائنس، صنعت، طب، زراعت اور ٹیکنالوجی سب اسی علمی استعداد کی شاخیں ہیں۔ فرشتے عبادت میں کامل ہونے کے باوجود اس علمی میدان میں انسان کے ہم پلہ نہیں قرار پائے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں علم محض معلومات کا نام نہیں بلکہ انسان کی کرامت کا سرچشمہ ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ یہی علم جب غرور اور غلط استعمال کا شکار ہو جائے تو تباہی کا ذریعہ بن جاتا ہے، جیسا کہ ابلیس نے اپنے علم و عبادت کے باوجود تکبر سے انہی درجات کو گنوا دیا۔ اس لیے قرآن انسان کے علم کو ہدایت کے تابع رکھتا ہے، اور علم کی اصل خوبصورتی یہ ہے کہ وہ انسان کو اللہ کی معرفت، اپنی ذمہ داری کے احساس اور مخلوق کی خدمت کی طرف لے جائے۔

فرشتوں کا سجدہ اور تکریمِ انسان

فرشتوں کا آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا انسان کی فضیلت کا تیسرا شاندار مظہر ہے۔ یہ سجدہ عبادت کا سجدہ نہیں تھا بلکہ تعظیم و تکریم کا تھا جو اللہ کے حکم سے ہوا، اور اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نورانی و مطیع مخلوق سے انسان کی عزت کا عملی اعتراف کرایا۔ سورۃ الاعراف اور سورۃ الحجر میں بھی یہی واقعہ اسی زور کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ اس سے انسانی جان، مال اور عزت کی حرمت کا وہ تصور ملتا ہے جو پورے اسلامی قانون کی بنیاد ہے: انسان محترم ہے کیونکہ اللہ نے اسے محترم بنایا ہے۔ سورۃ الاسراء (آیت 70) کے مفہوم میں بنی آدم کو عزت دیے جانے، خشکی و تری میں سواری دیے جانے اور پاکیزہ رزق عطا کیے جانے کا ذکر ہے۔ اسی کرامت کی بنا پر اسلام میں نسل، رنگ، زبان اور دولت انسان کی قدر کا پیمانہ نہیں، اصل پیمانہ تقویٰ اور کردار ہے (سورۃ الحجرات، آیت 13 کا مفہوم)۔ چنانچہ انسانی فضیلت طبقاتی نہیں بلکہ خدائی عطیہ ہے، اور جو معاشرہ اس کرامت کو پامال کرتا ہے وہ درحقیقت قرآن کے اعلانِ فضیلت کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

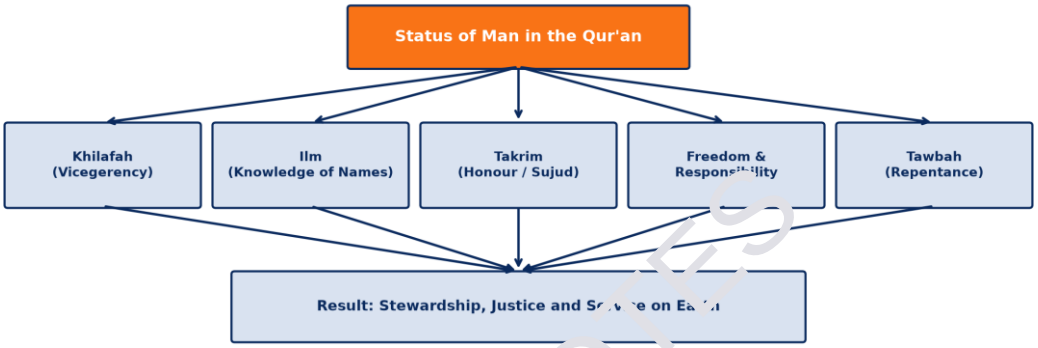
آزادی، امتحان اور توبہ: فضیلت کے دیگر پہلو

انسان کے مقام کا چوتھا پہلو اس کی آزادی اور اختیار ہے۔ فرشتے اطاعت پر مجبور بے اختیار مخلوق ہیں، جبکہ انسان کو نیکی اور بدی میں انتخاب کی آزادی دی گئی ہے، اور یہی آزادی اس کے اجر و سزا اور اس کی اصل عظمت کی بنیاد ہے۔ آدم علیہ السلام کی لغزش اور پھر توبہ نے انسانیت کو یہ عظیم درس دیا کہ غلطی کرنا انسانی فطرت کا حصہ ہے لیکن اصل فضیلت غلطی پر اصرار میں نہیں بلکہ رجوع، ندامت اور اصلاح میں ہے۔ ابلیس اور آدم علیہ السلام کے رویوں کا تقابل اس فرق کو واضح کرتا ہے: ابلیس نے خطا کے بعد تکبر اور حجت بازی کی، جبکہ آدم علیہ السلام نے عاجزی سے اپنے ظلم کا اعتراف کیا، تو اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔ اسی سے انسان کی زندگی کا قانون ملتا ہے کہ کامیابی بے خطا ہونے میں نہیں بلکہ توبہ و اصلاح میں ہے۔ مزید برآں زمین پر نزول سزا نہیں بلکہ خلافت کے مشن کا آغاز تھا، کیونکہ انسان کی اصل منزل زمین ہی تھی، جنت میں قیام ایک تربیتی مرحلہ تھا جس میں دوستی و دشمنی (شیطان) کی پہچان کرا دی گئی۔

جدول 1: انسان کے مقام و فضیلت کے نمایاں پہلو

پہلو	قرآنی حوالہ (سورہ)	عملی نتیجہ
خلافت	البقرہ	زمین کی امانت داری اور عدل کی ذمہ داری
علم اسماء	البقرہ	تحقیق، زبان اور تمدن کی بنیاد
تکریم (سجدہ فرشتگان)	الاعراف، الحجر	انسانی جان و عزت کی حرمت
آزادی و اختیار	الکہف، الدھر	اجر و سزا اور اخلاقی ذمہ داری
توبہ و رجوع	البقرہ، الاعراف	اصلاح اور امید کا دروازہ ہمیشہ کھلا

Figure 1: Foundations of Human Status and Dignity (Surah al-Baqarah 2:30-39)



شکل 1: قرآن کی روشنی میں انسان کے مقام و فضیلت کی بنیادیں (سورۃ البقرہ)۔

خاتمہ

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور فرشتوں کے مکالمے کا واقعہ انسان کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتا ہے: انسان زمین کا مالک نہیں، خلیفہ ہے؛ اس کی برتری طاقت میں نہیں، علم و امانت میں ہے؛ اس کی عزت اللہ کی عطا ہے جس کا تقاضا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کی بھی عزت کرے؛ اور اس کی لغزشوں کا علاج مایوسی نہیں، توبہ ہے۔ جو انسان اس مقام کو پہچان لیتا ہے وہ زمین پر فساد کے بجائے اصلاح کا ذریعہ بنتا ہے، اور یہی اس واقعے کا اصل پیغام اور قرآن کے مطالعے کا حاصل ہے۔ لہٰذا طالب علم کو اس واقعے سے خود احتسابی کا درس لینا چاہیے کہ وہ اپنی علمی صلاحیت، اپنے اختیار اور اپنے وقت کی امانت کو خلافت کے مقصد کے مطابق استعمال کرے۔ یہی انسان کی حقیقی فضیلت ہے کہ وہ عزت پا کر بھی عاجز رہے اور منصب پا کر بھی خدمت گزار بنے۔

سوال نمبر 2: واقعہ قتل، گائے ذبح کرنے کا حکم اور اطاعتِ الٰہی کے اصول (20 نمبر)

سوال نمبر 2۔ واقعہ قتل اور گائے ذبح کرنے کے حکم کی حکمت بیان کریں اور یہ بتائیں کہ اس واقعے سے اطاعتِ الٰہی کے کون سے اصول سامنے آتے ہیں؟ (20)

تعارف

سورۃ البقرہ میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے جو واقعات بیان ہوئے ہیں ان میں ایک نمایاں واقعہ ایک مقتول کی لاش اور اس کے قاتل کی تلاش سے متعلق ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا اور پھر اس گائے کے ایک حصے سے مردے کو مارنے (یعنی لگانے) پر مقتول کے زندہ ہو کر قاتل کا نام بتا دینے کا معجزہ ظاہر ہوا (سورۃ البقرہ، آیات 67 تا 73 کا مفہوم)۔ یہ واقعہ قرآن نے محض ایک پرانا قصہ سنانے کے لیے ذکر نہیں کیا، بلکہ اس میں حکم کی حکمت، انسانی نفسیات کی کمزوریوں اور اطاعتِ الٰہی کے بنیادی اصول پوشیدہ ہیں۔ بنی اسرائیل نے سیدھے حکم کو ٹالنے کے لیے سوالات کی بھرمار کی، گائے کی خصوصیات پوچھتے رہے اور ہر جواب کے بعد پابندی سخت ہوتی گئی، یہاں تک کہ مشکل سے ایسی گائے ملی۔ یہ طرزِ عمل آج کے انسان کے لیے آئینہ ہے کہ دین کے واضح احکام کو کج بحثی سے ٹالنا خود انسان کے لیے مشکلات کھڑی کرتا ہے۔ اس جواب میں پہلے واقعے کا پس منظر و خلاصہ، پھر گائے ذبح کے حکم کی حکمتیں اور آخر میں اطاعت کے اصول تفصیل سے بیان کیے جائیں گے۔

واقعے کا پس منظر اور خلاصہ

روایاتِ تفسیر اور قرآن کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص قتل ہو گیا اور قاتل معلوم نہ ہو سکا، جس سے قبائل میں اختلاف بلکہ جھگڑے کی کیفیت پیدا ہو گئی اور ہر فریق دوسرے پر الزام لگانے لگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس مقدمہ آیا تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ایک گائے ذبح کی جائے۔ بنی اسرائیل نے اس حکم کو مذاق سمجھا اور کہا کہ آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں، جس پر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں جاہلوں میں سے ہونے سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں (آیت 67 کا مفہوم)۔ پھر انہوں نے گائے کی عمر، رنگ اور کیفیت کے بارے میں یکے بعد دیگرے سوالات کیے، اور ہر سوال کے جواب میں شرط مزید واضح اور تنگ ہوتی گئی: نہ بوڑھی ہو نہ بچی، درمیانی عمر کی ہو، رنگ گہرا زرد ہو جو دیکھنے والوں کو بھائے، وہ ہل جوتنے اور کھیتی سیراب کرنے کی مشقت میں استعمال نہ ہوئی ہو، صحیح سالم اور بے داغ ہو۔ بالآخر وہ گائے مشکل سے حاصل کر کے ذبح کی گئی، حالانکہ ان کا دل اس پر آمادہ نہیں تھا (آیت 71 کا مفہوم)۔ پھر حکم ہوا کہ گائے کے ایک ٹکڑے سے مقتول کو مارا جائے، چنانچہ مقتول زندہ ہوا اور اس نے قاتل کی نشاندہی کر دی۔ قرآن نے اسی مقام پر فرمایا کہ اللہ اسی طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔

گائے ذبح کے حکم کی حکمت (1): قاتل کی دریافت اور عدل کی فراہمی

اس حکم کی پہلی حکمت عدل و انصاف کا قیام ہے۔ قتل انسانی جان کی حرمت کے خلاف سب سے بڑا جرم ہے اور جب تک قاتل ظاہر نہ ہو معاشرے میں بدامنی، انتقام اور باہمی الزام تراشی پھیلتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے وہ ذریعہ پیدا فرمایا جس سے سچ سامنے آ گیا، بے گناہ الزام سے بری ہوئے اور مجرم کو اس کے انجام کی طرف راستہ کھلا۔ اس سے یہ اصول ملتا ہے کہ احکامِ الٰہی کا مقصد انسانی معاشرے کی حفاظت ہے اور بعض اوقات حکم کی صورت بظاہر عام معمول سے ہٹ کر بھی ہو سکتی ہے لیکن اس کے پیچھے پوشیدہ مصلحت انسان کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے۔ شارع کی حکمت پر اعتماد ہی دراصل وہ بنیاد ہے جس سے عبد اللہ کے حکم کو دل سے قبول کرتا ہے۔ مزید یہ کہ اس واقعے سے قیامت اور بعث بعد الموت کی حقیقت بھی عملی مشاہدے سے ثابت ہوئی کہ مردہ انسان اللہ کے حکم سے زندہ ہو کر بول پڑا، چنانچہ واقعہ عقیدے کی تربیت کا ذریعہ بھی بنا۔

گائے ذبح کے حکم کی حکمت (2): بت پرستی کی جڑ کاٹنا

دوسری بڑی حکمت بنی اسرائیل کے دلوں سے گائے کی تقدیس کا خاتمہ ہے۔ بنی اسرائیل مصر میں لمبا عرصہ رہے جہاں گائے کو مقدس سمجھا جاتا تھا، اور اسی ذہنیت کا اثر تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی غیر موجودگی میں انہوں نے بچھڑے کو معبود بنا لیا تھا (سورۃ البقرہ، آیات 51 تا 54، سورۃ الاعراف اور سورۃ طٰہٰ میں اس واقعے کا ذکر)۔ گائے کو انہی کے ہاتھوں ذبح کرانا اس غلط تقدیس کو توڑنے کی عملی تربیت تھی کہ مخلوق خدا نہیں ہو سکتی، جو ذبح ہو جائے اور گوشت کے ٹکڑوں میں بدل جائے وہ معبود ہونے کے لائق نہیں۔ یہ حکمت اصولِ توحید کی گہرائی سمجھاتی ہے کہ شریعت بعض احکام کے ذریعے معاشرے کی غلط رسموں اور شرکیہ تصورات کی جڑ کاٹتی ہے، صرف زبانی وعظ پر اکتفا نہیں کرتی۔ اسی انداز کو بعد کی شریعتوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ عملی اقدامات کے ذریعے جاہلیت کی رسموں کو ختم کیا گیا۔ چنانچہ حکم کی حکمت صرف ظاہری مقصد تک محدود نہیں ہوتی بلکہ عقیدے کی اصلاح بھی اس کا بڑا ہدف ہوتا ہے۔

گائے ذبح کے حکم کی حکمت (3): انسانی نفسیات کی اصلاح

تیسری حکمت یہ ہے کہ اس واقعے نے انسانی نفسیات کی ایک دائمی کمزوری کو بے نقاب کیا، اور وہ ہے کٹ حجتی، ٹال مٹول اور حکم ماننے میں سستی۔ بنی اسرائیل اگر پہلے ہی حکم پر عمل کر لیتے تو کوئی بھی گائے کافی ہوتی، مگر جتنے سوالات کرتے گئے اتنی ہی پابندیاں بڑھتی گئیں اور معاملہ مشکل ہوتا گیا۔ مفسرین نے اسی نکتے کو بنیاد بنا کر یہ اصول اخذ کیا ہے کہ غیر ضروری سوالات اور بال کی کھال نکالنا دینی زندگی کو مشکل بنا دیتا ہے، جبکہ سادگی سے اطاعت کرنے والے کے لیے راستہ آسان ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ انسان کے باطن کو دیکھتا ہے؛ ان کے بارے میں فرمایا گیا کہ انہوں نے بمشکل ذبح کیا اور وہ کرنے والے معلوم نہ ہوتے تھے، یعنی عمل تو ہوا مگر دل کی آمادگی موجود نہ تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اطاعت کی روح صرف ظاہری عمل نہیں بلکہ دل کی رضامندی ہے اور یہی قبولیت کی شرط ہے۔ شرعی معاملات میں کسی واقف کار عالم سے راہ نمائی لینا الگ بات ہے، مگر حکم سے بچنے کے لیے سوالات گھڑنا ایک اور چیز ہے جس کی اس واقعے میں سخت مذمت ہے۔

اطاعتِ الٰہی کے وہ اصول جو اس واقعے سے سامنے آتے ہیں

اس واقعے سے اطاعت کے کئی اصول اخذ ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ اصل اطاعت بلا تردد اور فوری عمل ہے؛ جب حکم واضح ہو جائے تو تاخیر اور چون و چرا اس کی روح کے خلاف ہے۔ دوم یہ کہ اطاعت کا تقاضا یہ ہے کہ حکم کی حکمت سمجھ میں آئے یا نہ آئے، مومن شارع کی حکمت پر اعتماد کر کے سرِ تسلیم خم کرتا ہے، کیونکہ نہ ہر حکم کی تمام حکمتیں انسانی عقل کی گرفت میں آتی ہیں اور نہ یہ ضروری ہے۔ سوم یہ کہ نبی اور اللہ کے حکم کو مذاق یا ہلکا سمجھنا ایمان کے لیے سخت خطرناک ہے، جیسا کہ بنی اسرائیل کی اس جسارت پر موسیٰ علیہ السلام نے اسے جہالت سے تعبیر فرمایا۔ چہارم یہ کہ اطاعت میں دل کی شرکت ضروری ہے، زبردستی اور کراہت کے ساتھ کیا گیا عمل بے روح ہو جاتا ہے۔ پنجم یہ کہ ٹال مٹول انسان کی مشکلات بڑھاتا ہے، چنانچہ اصول یہ بنا کہ دین کے معاملے میں سہولت تبھی میسر آتی ہے جب انسان سادگی سے عمل کرے۔ ششم یہ کہ اللہ کے حکم کے سامنے اپنی پسند و رائے کو قربان کرنا ہی عبدیت ہے، کیونکہ آزمائش اصل میں اسی چیز کی ہوتی ہے کہ انسان اپنی خواہش کے خلاف حکم کو بھی قبول کرتا ہے یا نہیں۔

عصرِ حاضر کے لیے اسباق

اس واقعے کے اسباق آج بھی اتنے ہی زندہ ہیں جتنے اس زمانے میں تھے۔ آج بھی بہت سے لوگ واضح شرعی احکام کو فلسفے اور سوالات کے بوجھ سے ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر شکایت کرتے ہیں کہ دین مشکل ہے، حالانکہ مشکل ان کی اپنی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ اسی طرح انصاف کے قیام کے لیے سچ کو سامنے لانے کی ہر ممکن کوشش کرنا اور مجرم کی نشاندہی کو اللہ کی نصرت سمجھنا بھی اسی واقعے کا درس ہے۔ یہ بات بھی یاد رہنی چاہیے کہ اس واقعے سے متعلق جزئی فقہی و اعتقادی نزاعات میں قطعی رائے اہلِ علم کا حق ہے، یہاں مقصد صرف وہ عمومی اصول بیان کرنا ہے جو قرآن کے ظاہر مفہوم سے ملتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ واقعہ مومن کو یہ تربیت دیتا ہے کہ وہ اللہ کے حکم کو زندگی کا محور بنائے، حکم سنتے ہی دل کی آمادگی کے ساتھ آگے بڑھے اور ہر معاملے میں اللہ کی حکمت پر بھروسا رکھے، کیونکہ نجات کا راستہ اسی اطاعت میں ہے۔

خاتمہ

آخر میں خلاصہ یہ ہے کہ واقعہ قتل اور گائے ذبح کا حکم حکمتوں سے بھرا ہوا ہے: عدل کا قیام، توحید کی حفاظت، بت پرستی کی جڑ کا خاتمہ، انسانی نفسیات کی اصلاح اور بعث بعد الموت کا عملی ثبوت اس کی نمایاں حکمتیں ہیں۔ اس سے ملنے والے اطاعت کے اصول ہر دور کے لیے رہنما ہیں کہ حکمِ الٰہی کو بلا تردد، دل کی رضامندی اور شارع کی حکمت پر اعتماد کے ساتھ قبول کیا جائے اور کٹ حجتی و ٹال مٹول سے کلی اجتناب کیا جائے۔ جو قوم ان اصولوں پر چلتی ہے اس کے لیے دین آسان اور زندگی پر سکون ہو جاتی ہے، اور جو قوم بنی اسرائیل کے اس رویے کی طرف لوٹتی ہے وہ اپنے لیے خود مشکلات کا دروازہ کھولتی ہے۔ قرآن نے یہ واقعہ اسی لیے محفوظ کر دیا کہ بعد کی امتیں اس سے عبرت اور رہنمائی حاصل کرتی رہیں۔

سوال نمبر 3: امتِ وسط کا مفہوم اور امتِ مسلمہ کی ذمہ داریاں (20 نمبر)

سوال نمبر 3۔ "وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا" کے مفہوم کی وضاحت کریں اور امتِ مسلمہ کی ذمہ داریوں پر گفتگو کریں۔ (20)

تعارف

سورۃ البقرہ کی آیت 143 میں امتِ مسلمہ کو "امتِ وسط" قرار دیا گیا ہے، اور اس مختصر جملے میں اس امت کی فطرت، اس کا مزاج اور اس کا عالمی کردار سمو دیا گیا ہے۔ آیت کے سیاق میں تحویلِ قبلہ کا ذکر ہے، اور یہ پیغام دیا گیا ہے کہ قبلے کی تبدیلی کے ساتھ امت کو وہ منصب بھی عطا ہوا ہے جس کے تحت وہ دنیا کی قوموں کے لیے گواہ بنے گی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس امت پر گواہ ہوں گے (آیت مذکورہ کا مفہوم)۔ امتِ وسط ہونا محض ایک اعزازی لقب نہیں بلکہ ایک بھاری ذمہ داری کا اعلان ہے۔ دنیائے انسانیت افراط و تفریط کا شکار رہی ہے: کہیں روحانیت کے نام پر دنیا سے کلی کنارہ کشی، کہیں مادیت کے نام پر اخلاق و روح سے بے نیازی؛ کہیں قانون کی سختی میں رحمت کا فقدان، کہیں نرمی کے نام پر قانون کی بے حرمتی۔ اسلام نے اپنی امت کو انہی دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال کا راستہ دیا ہے۔ اس جواب میں لفظ "وسط" کے مفاہیم، اس کی خصوصیات اور پھر اس منصب سے پیدا ہونے والی ذمہ داریاں بیان کی جائیں گی۔

لفظ "وسط" کے مفاہیم

عربی زبان میں "وسط" کا لفظ درمیان کے معنوں میں بھی آتا ہے اور بہتر و افضل کے معنوں میں بھی۔ مفسرین نے اس آیت میں دونوں مفاہیم کو جمع کیا ہے: امتِ مسلمہ قوموں کے درمیان معتدل بھی ہے اور بہترین بھی، کیونکہ عدل و اعتدال ہی وہ صفت ہے جو کسی جماعت کو افضل بناتی ہے۔ بعض مفسرین نے "وسط" کا ترجمہ عادل کیا ہے، یعنی یہ امت ایسی ہے جس کا قول و فعل انصاف پر مبنی ہو گا اسی لیے قیامت کے دن اس کی گواہی معتبر ہو گی۔ اس اعتدال کا دائرہ بہت وسیع ہے: عقیدے میں یہ امت اللہ کی ذات و صفات کے معاملے میں تعطیل و تشبیہ دونوں انتہاؤں سے دور ہے؛ عبادت میں دنیا سے کٹنے والی رہبانیت اور عبادت سے کلی غفلت دونوں سے بیگانہ ہے؛ قانون میں قصاص جیسی سختی کے ساتھ عفو و درگزر کی ترغیب بھی رکھتی ہے؛ اور تمدن میں روح اور مادے کو ساتھ لے کر چلتی ہے۔ گویا وسطیت اس امت کا مزاج ہے جو اسے ہر دور میں زندہ اور متوازن رکھتا ہے۔

امتِ وسط کی نمایاں خصوصیات

امتِ وسط کی پہلی خصوصیت اعتدال و توازن ہے کہ اس کا دین افراط و تفریط سے پاک ہے، نہ اس میں غلو ہے نہ جفا۔ دوسری خصوصیت عدل ہے کہ یہ امت دوست و دشمن دونوں کے ساتھ انصاف کی پابند ہے، اور سورۃ المائدہ (آیت 8) کے مفہوم میں کسی قوم کی دشمنی بھی اسے ناانصافی پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ تیسری خصوصیت خیر خواہی اور نفع رسانی ہے کیونکہ اس امت کو نوعِ انسانی کی بھلائی کے لیے برپا کیا گیا ہے (سورۃ آلِ عمران، آیت 110 کا مفہوم)۔ چوتھی خصوصیت علمی و عملی گواہی ہے کہ یہ امت اپنے قول سے زیادہ اپنے عمل سے حق کی شہادت دیتی ہے۔ پانچویں خصوصیت وحدت ہے کہ اس کا مرکز ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسول اور ایک قبلہ ہے جس سے اس کے اندر انتشار کی گنجائش کم ہو جاتی ہے۔ یہ خصوصیات بکھری ہوئی نہیں بلکہ ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں: اعتدال سے عدل پیدا ہوتا ہے، عدل سے گواہی معتبر ہوتی ہے اور وحدت سے یہ تمام اوصاف اجتماعی قوت میں بدل جاتے ہیں۔

ذمہ داری (1): حق کی گواہی اور دعوت

امتِ وسط کی سب سے پہلی ذمہ داری وہی ہے جو آیت میں صراحت سے بیان ہوئی ہے، یعنی لوگوں پر گواہ بننا۔ گواہی کا مطلب یہ ہے کہ یہ امت اللہ کے دین کو اپنے علم، اپنے کردار اور اپنی دعوت کے ذریعے دنیا کے سامنے اس طرح پیش کرے کہ حجت قائم ہو جائے۔ گواہ بننے کے لیے خود گواہ کا عادل ہونا شرط ہے، کیونکہ بدکردار گواہ کی بات محکمے میں بھی قبول نہیں ہوتی چہ جائیکہ قوموں کے محکمے میں قبول ہو۔ اسی لیے دعوت کا کام صرف زبان سے نہیں بلکہ تجارت میں دیانت، معاہدے کی پاسداری، کمزور کی مدد اور پڑوسی کے حقوق جیسے عملی مظاہر سے ہوتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جہاں مسلمان تاجروں اور صوفیائے کرام کے اخلاق نے اسلام پھیلایا وہاں فتوحات کی تلوار نہیں پہنچی تھی۔ آج کے دور میں یہ گواہی میڈیا، تعلیم اور سماجی خدمت کے ذریعے بھی دی جا سکتی ہے بشرطیکہ اس کی بنیاد اخلاص اور حسنِ اخلاق ہو۔ جو امت خود اپنے دین پر عمل نہ کرے وہ گواہی کے منصب سے عملاً معزول ہو جاتی ہے۔

ذمہ داری (2): عدل کا قیام اور ظلم کی مزاحمت

دوسری ذمہ داری عدل کا قیام ہے۔ امتِ وسط کا کام دنیا میں میزان قائم کرنا ہے، یعنی طاقتور کو کمزور پر ظلم سے روکنا، حق دار کو اس کا حق دلانا اور قانون کے سامنے سب کو برابر رکھنا۔ قرآن نے قسط و عدل کو انبیا کی بعثت کے مقاصد میں شامل کیا ہے (سورۃ الحدید، آیت 25 کا مفہوم)، لہٰذا یہ ذمہ داری صرف عدالتوں کی نہیں بلکہ گھر، بازار، ادارے اور ریاست سب کی ہے۔ امت کی تاریخ میں عدل کی چمک اسی منصب کا ثمر تھی اور زوال کا ایک سبب یہی ہوا کہ عدل کی جگہ سفارش، رشوت اور طاقت نے لے لی۔ آج بھی جو مسلمان معاشرہ اپنے اندر عدل بحال کر لے وہی وسطیت کا حقیقی وارث کہلانے کا حق دار ہے۔ اس ذمہ داری کا ایک پہلو مظلوم کی حمایت بھی ہے خواہ وہ کسی مذہب و نسل سے تعلق رکھتا ہو، کیونکہ امتِ وسط کا عدل عالمگیر ہوتا ہے، گروہی نہیں ہوتا۔

ذمہ داری (3): افراط و تفریط سے اجتناب اور اتحاد کی حفاظت

تیسری ذمہ داری خود اپنے اندر اعتدال کی حفاظت ہے۔ امت کو غلو سے بھی بچنا ہے جو دین میں نئی سختیاں گھڑ لے اور تشدد و تکفیر تک پہنچا دے، اور اس انحلال سے بھی بچنا ہے جو دین کو صرف رسم یا نجی عقیدہ بنا کر اجتماعی زندگی سے نکال دے۔ دونوں رویے وسطیت کے خلاف ہیں۔ اسی سے جڑی ہوئی ذمہ داری اتحاد کی حفاظت ہے، کیونکہ منتشر امت نہ گواہ بن سکتی ہے نہ میزان قائم کر سکتی ہے۔ فرقہ واریت، لسانی و علاقائی تعصب اور باہمی نفرت اس منصب کے منافی ہیں۔ اعتدال کا تقاضا یہ ہے کہ اختلاف کو علمی حدود میں رکھا جائے، بزرگوں کا ادب اور عام مسلمان کی عزت محفوظ رہے، اور مشترکہ دینی و ملی مقاصد پر سب متحد ہو جائیں۔ یاد رہے کہ اعتدال کا مطلب حق پر سمجھوتا نہیں بلکہ حق کو حکمت، نرمی اور توازن کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ وہ امت جو اندر سے متوازن ہو وہی باہر کی دنیا کے لیے نمونہ بن سکتی ہے۔

موجودہ دور میں ذمہ داریوں کا عملی تقاضا

موجودہ دور میں امتِ وسط کی ذمہ داریوں کا عملی تقاضا یہ ہے کہ مسلمان تعلیم و تحقیق میں آگے بڑھیں، معیشت میں دیانت و خودداری پیدا کریں، عورت، بچے، بوڑھے اور اقلیت سمیت ہر طبقے کے حقوق کی عملی حفاظت کریں اور دنیا کو امن کا وہ نمونہ دکھائیں جس کی وہ نظریاتی دعویدار ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ امت اپنی گواہی کی اہلیت بحال

کرے، یعنی انفرادی کردار کی اصلاح سے اجتماعی تبدیلی کی طرف بڑھے۔ میڈیا کے دور میں ایک مسلمان کا کردار پوری امت کی شبیہ بن جاتا ہے، لہٰذا سچائی، وعدے کی پابندی اور قانون کی پاسداری کو اجتماعی شعار بنانا ناگزیر ہے۔ ان ذمہ داریوں کا تعین کرتے وقت یہ اصول بھی مدِ نظر رہے کہ شرعی احکام کی جزئی تطبیق کے مسائل میں اہلِ علم کی راہ نمائی حاصل کی جائے، یہ گائیڈ عمومی قرآنی اصولوں کی محدود رہنمائی دیتا ہے۔

خاتمہ

خلاصہ یہ ہے کہ "امتِ وسط" کا مفہوم اعتدال، عدل اور فضیلت کا جامع عنوان ہے: یہ امت نہ مادہ پرست ہے نہ دنیا گریز، نہ قانون میں بے رحم نہ رحمت میں بے اصول۔ اس کا منصب اسے تین بڑی ذمہ داریاں سونپتا ہے: حق کی عملی گواہی و دعوت، عدل کا عالمگیر قیام، اور اپنے اندر اعتدال و اتحاد کی حفاظت۔ جب تک امت ان اوصاف پر قائم رہی دنیا کی قیادت اس کے پاس رہی، اور جب اس نے وسطیت کھوئی تو خود افراط و تفریط اور انتشار کا شکار ہو گئی۔ لہٰذا امتِ وسط منا اعزاز کے ساتھ امتحان بھی ہے، اور اس امتحان میں کامیابی کا واحد راستہ قرآن کی طرف رجوع اور سیرتِ نبوی کے اسوے پر چلنا ہے۔

سوال نمبر 4: قصاص کے احکام کی حکمت اور انسانی جان کا تحفظ (20 نمبر)

سوال نمبر 4۔ قصاص کے احکام کی حکمت بیان کریں اور واضح کریں کہ اسلامی قانونِ قصاص انسانی جان کے تحفظ میں کس طرح کردار ادا کرتا ہے؟ (20)

تعارف

انسانی جان کی حفاظت اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے ہے، اور شریعت کے بڑے مقاصد (حفظِ نفس، حفظِ دین، حفظِ عقل، حفظِ نسل اور حفظِ مال) میں جان کی حفاظت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اسی مقصد کے لیے قرآن حکیم نے قصاص کا قانون دیا اور سورۃ البقرہ (آیات 178 تا 179) میں قتلِ عمد کی سزا، معافی اور دیت کے اصول بیان کرتے ہوئے ارشاد کا مفہوم یہ بتایا کہ قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے، اے عقل والو، تاکہ تم پرہیز گار بنو۔ دنیا حیران رہتی ہے کہ بظاہر موت کی سزا کو زندگی کیسے قرار دیا

گیا، لیکن یہی اس قانون کی گہری حکمت ہے۔ قصاص کا مقصد انتقام کی آگ کو بھڑکانا نہیں بلکہ قتل کے سلسلے کو روکنا، مظلوم کے ورثا کو انصاف دلانا اور معاشرے کو یہ پیغام دینا ہے کہ انسانی جان ارزاں نہیں۔ اس جواب میں پہلے قصاص کا مفہوم و قانونی خاکہ، پھر اس کی حکمتیں اور آخر میں جان کے تحفظ میں اس کے کردار کی وضاحت آئے گی، اس تنبیہ کے ساتھ کہ اس قانون کا نفاذ ریاست اور عدالت کا کام ہے، افراد کا نہیں۔

قصاص کا مفہوم اور قانونی خاکہ

قصاص کے لغوی معنی برابر کرنے اور پیچھے چلنے کے ہیں، اور شرعی اصطلاح میں اس سے مراد وہ سزا ہے جو جرم کے برابر دی جائے، یعنی قتلِ عمد میں قاتل کو اسی جرم کی سزا دی جائے جو اس نے کیا۔ سورۃ البقرہ (آیت 178) کے مفہوم کے مطابق آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت کا اصول جاہلیت کے طبقاتی امتیاز کو ختم کرنے کے لیے بیان ہوا، یعنی جرم میں دولت، خاندان اور مرتبہ نہیں دیکھا جائے گا، قانون سب کے لیے ایک ہو گا۔ اسی آیت میں یہ نرمی بھی رکھی گئی کہ اگر مقتول کے ورثا قاتل کو معاف کر دیں یا دیت (خون بہا) پر صلح کر لیں تو معاملہ معروف طریقے سے مکمل کیا جائے اور ادائیگی احسن انداز میں ہو، اور پھر اس پر ظلم کرنے والے کے لیے دردناک عذاب کی وعید ہے۔ سورۃ المائدہ (آیت 45) میں بھی قصاص کے اصول اور عفو کو صدقہ قرار دینے کا مفہوم آیا ہے۔ یہ خاکہ بتاتا ہے کہ اسلامی قانون میں سختی اور رحمت ایک ساتھ موجود ہیں: سزا بھی ہے، معافی کا دروازہ بھی، اور صلح کا راستہ بھی۔

حکمت (1): قصاص خود زندگی کی ضمانت ہے

قرآن کا اعلان کہ قصاص میں زندگی ہے، قانون سازی کی تاریخ کا انمول اصول ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب ہر ممکنہ قاتل کو علم ہو کہ قتل کرنے کی صورت میں اس کی اپنی جان بھی قانوناً جا سکتی ہے تو وہ قتل سے رک جاتا ہے، یوں ایک سزا سینکڑوں زندگیوں کو بچا لیتی ہے۔ جرائم کے اسباب پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قتل زیادہ تر وہیں ہوتے ہیں جہاں مجرم کو سزا کا یقین نہ ہو یا قانون طاقتور کے سامنے کمزور ہو۔ قصاص دو طرح سے زندگی دیتا ہے: ایک یہ کہ مجرم رک جاتا ہے، دوسرا یہ کہ ورثا کے دلوں کی انتقامی آگ انصاف کے ذریعے بجھ جاتی ہے اور نسل در نسل چلنے والی دشمنیوں اور جوابی قتل کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ عرب جاہلیت میں ایک قتل کے بدلے پورے قبیلے تباہ ہو جاتے

تھے، اسلام نے بدلہ فرد تک محدود کر کے اور اسے عدالت کے سپرد کر دیا، یوں قصاص نے ذاتی انتقام کی جگہ قانونی انصاف لے لیا۔ یہی وجہ ہے کہ مفسرین نے کہا کہ قصاص کی زندگی دینی اثریت اس کے ظاہری موت ہونے سے کہیں بڑی ہے۔

حکمت (2): عدل، مساوات اور مظلوم کے حق کی بحالی

قصاص کی دوسری حکمت عدل کا قیام ہے۔ اس قانون میں مقتول کے حق کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے، ورثا کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ قصاص کا مطالبہ کریں، معاف کر دیں یا دیت قبول کریں۔ یہ اختیار مظلوم خاندان کے زخموں پر وہ مرہم ہے جو کسی اور نظام میں اس شان کے ساتھ موجود نہیں، کیونکہ عام طور پر سزا کا معاملہ ریاست اور مجرم کے درمیان رہتا ہے اور ورثا حاشیے پر رہ جاتے ہیں۔ مساوات اس قانون کی روح ہے کہ امیر و غریب، طاقتور و کمزور سب کے لیے ایک ہی قانون ہے، جیسا کہ سورۃ البقرہ کی آیت کے انداز سے واضح ہوتا ہے اور سورۃ النساء والمائدہ کے دیگر احکام بھی قتلِ ناحق کو پوری انسانیت کے قتل کے برابر قرار دینے کا مفہوم رکھتے ہیں (سورۃ المائدہ، آیت 32)۔ یہ مساوات معاشرے میں قانون کی ساکھ قائم کرتی ہے، اور قانون کی ساکھ ہی وہ چیز ہے جو جرائم کو نفسیاتی طور پر روکتی ہے۔ مزید یہ کہ شریعت نے اس قانون کو انتقامی نہیں بلکہ اصلاحی بنا دیا ہے، کیونکہ معاف کرنے کو اللہ کی رحمت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

جدول 1: قصاص، عفو اور دیت — تین راستوں کا تقابل

راستہ	شرعی بنیاد	معاشرتی فائدہ
قصاص	قتلِ عمد ثابت ہونے پر عدالت کے ذریعے سزا	جرم کی روک تھام اور انصاف کا احساس
عفو	ورثا کا از خود معاف کر دینا	دشمنی کا خاتمہ اور رحمت کا فروغ
دیت	صلح کی صورت میں خون بہا کی ادائیگی	متاثرہ خاندان کی مالی سہولت اور صلح

حکمت (3): معاشرتی امن اور قانون کی حاکمیت

تیسری حکمت معاشرے میں امن کا قیام ہے۔ جان کا تحفظ ہر تمدن کی پہلی ضرورت ہے، کیونکہ جہاں جان محفوظ نہ ہو وہاں نہ عبادت سکون سے ہوتی ہے، نہ تجارت، نہ تعلیم اور نہ خاندانی زندگی۔ قصاص کے قانون نے ریاست کو یہ ذمہ داری دی کہ وہ قاتل کو عدالت کے ذریعے سزا دے، اور افراد کو ذاتی انتقام سے روک دیا۔ قرآن نے قصاص کے بعد حد سے بڑھنے کو بھی ممنوع قرار دیا (سورۃ الاسراء، آیت 33 کا مفہوم) کہ مقتول کے ولی کو اختیار تو دیا گیا ہے مگر وہ قتل میں اسراف نہ کرے۔ یوں یہ قانون دونوں انتہاؤں کا علاج ہے: نہ مجرم کو کھلی چھوٹ، نہ مظلوم کو قانون ہاتھ میں لینے کی اجازت۔ اس طرح ایسے معاشرے میں وہ امن پیدا ہوتا ہے جس میں کمزور بھی طاقتور کے مظالم سے محفوظ رہتا ہے۔ اطمینان کی یہ کیفیت اقتصادی ترقی اور سماجی استحکام کی بنیاد بنتی ہے، کیونکہ سرمایہ اور اہلِ علم اسی جگہ ٹھہرتے ہیں جہاں جان و مال کا تحفظ ہو۔

قصاص انسانی جان کے تحفظ میں کیسے کردار ادا کرتا ہے؟

قصاص کا جان کے تحفظ میں کردار کم از کم چار سطحوں پر ظاہر ہوتا ہے۔ پہلی سطح نفسیاتی روک ہے کہ سزائے قصاص کا خوف قتل کے ارادے کو جڑ سے کاٹتا ہے۔ دوسری سطح قانونی ہے کہ قتل کو سنگین ترین جرم قرار دے کر اور اس کی تفتیش و ثبوت کو عدالتی عمل سے جوڑ کر معاشرے میں یہ شعور پیدا کیا جاتا ہے کہ جان کی قیمت سب سے زیادہ ہے۔ تیسری سطح سماجی ہے کہ ورثا کو انصاف ملنے سے جوابی قتل، قبائلی دشمنی اور نسلی کینہ ختم ہوتا ہے، جو پسماندہ معاشروں میں سینکڑوں زندگیاں نگل جاتا ہے۔ چوتھی سطح اخلاقی و دینی ہے کہ قرآن نے ایک انسان کے قتلِ ناحق کو پوری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دے کر (سورۃ المائدہ، آیت 32 کا مفہوم) ہر دل میں جان کی حرمت کا احساس راسخ کر دیا، اور یہ احساس قانون سے زیادہ مضبوط محافظ ہے۔ ان چاروں سطحوں کے اجتماع سے وہ ماحول بنتا ہے جسے قرآن نے قصاص میں زندگی کا نام دیا ہے۔ البتہ یہ نکتہ بنیادی ہے کہ ان تمام فوائد کا حصول اسی وقت ممکن ہے جب نفاذ شفاف عدالتی عمل سے ہو، اور کسی فرد یا گروہ کو خود سزا دینے کی ہرگز اجازت نہیں، کیونکہ غیر قانونی سزا خود فساد ہے۔

تنقیدی جائزہ: نرم سزاؤں کے نظام سے تقابل

موازنہ کرنے سے بات مزید واضح ہوتی ہے کہ جن معاشروں میں قتل کی سزا کو تقریباً ختم یا انتہائی نرم کر دیا گیا وہاں قتل کی شرح اور گینگ وار کے واقعات پر قابو پانا مشکل ہو گیا، جبکہ جہاں سخت اور یقینی سزا موجود ہو وہاں قتل کی [illegible] کم پائی جاتی ہیں، اگرچہ جرائم کی شرح کا تعلق معاشی و سماجی عوامل سے بھی ہوتا ہے اور محض ایک عامل سے نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں۔ اسلام کا نقطہ نظر ان دونوں میں متوازن ہے۔ اس [illegible] سخت رکھی مگر ثبوت کے تقاضے بھی سخت رکھے، شبہ کی صورت میں حدود و قصاص کو ٹالنے کا اصول دیا اور عفو و دیت کے دروازے کھلے رکھے۔ اس توازن سے یہ الزام بھی [illegible] جاتا ہے کہ اسلامی قانون بے رحمی پر مبنی ہے، کیونکہ جس قانون میں مقتول کے ورثا کی معافی کو صدقہ قرار دیا جائے اور صلح کو پسندیدہ کہا جائے وہ انتقام کا نہیں رحمت و حکمت کا قانون ہے۔

خاتمہ

خلاصہ یہ ہے کہ قصاص کے احکام کی حکمت انتقام نہیں بلکہ زندگی کی حفاظت ہے: یہ قانون مجرم کو روکتا ہے، ورثا کو انصاف دیتا ہے، دشمنیوں کا سلسلہ توڑتا ہے، مساوات قائم کرتا ہے اور جان کی حرمت کا شعور پیدا کرتا ہے۔ قرآن کا ارشاد کہ قصاص میں زندگی ہے، اسی جامع حکمت کا اعلان ہے۔ البتہ اس قانون کا نفاذ صرف ریاست اور آئینی عدالتی نظام کا حق ہے، عام افراد یا گروہوں کا اس میں دخل خود فساد فی الارض کے زمرے میں آسکتا ہے، اور کسی مخصوص مقدمے میں شرعی و قانونی رائے کا حق مستند علماء اور عدالتوں کو ہے۔ طالب علم کے لیے سبق یہ ہے کہ وہ انسانی جان کی حرمت کو اپنے کردار کا حصہ بنائے، اختلافات کو قانون و انصاف کے راستے سے حل کرے اور ظلم و زیادتی سے ہر حال میں اجتناب کرے، یہی قصاص کے مطالعے کا عملی حاصل ہے۔

سوال نمبر 5: انفاق فی سبیل اللہ کا قرآنی تصور اور اس کے معاشرتی فوائد (20 نمبر)

سوال نمبر 5۔ انفاق فی سبیل اللہ کے قرآنی تصور کو بیان کریں اور اس کے معاشرتی فوائد پر گفتگو کریں۔ (20)

تعارف

انفاق فی سبیل اللہ قرآن حکیم کے نمایاں ترین سماجی تصورات میں سے ہے۔ سورۃ البقرہ میں نماز کے بعد سب سے زیادہ جس عبادت پر زور دیا گیا ہے وہ اللہ کے دیے ہوئے رزق میں سے اس کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ انفاق کا مادہ "نفق" ہے جس کے معنی خرچ کر کے ختم کرنے کے ہیں، اور شرعی اصطلاح میں اس سے مراد اپنا مال اللہ کی رضا کے لیے اس کی مخلوق کی ضرورت پر خرچ کرنا ہے۔ قرآن نے دولت کو انسان کی ذاتی ملکیت کے بجائے اللہ کی عطا اور امانت قرار دیا ہے (سورۃ الحدید، آیت 7 کا مفہوم کہ اللہ نے تمہیں جس مال کا جانشین بنایا ہے اس میں سے خرچ کرو)۔ یہی تصور انسان کو کنجوسی اور حرص سے نکال کر سخاوت اور ایثار کی طرف لے جاتا ہے۔ اسلام نے معاشرے کی معاشی زندگی کو صرف کمانے پر نہیں بلکہ بانٹنے پر بھی کھڑا کیا ہے، کیونکہ محض دولت کی گردش ہی معاشرے کو زندہ رکھتی ہے۔ اس جواب میں انفاق کا مفہوم و اقسام، اس کی شرائط و آداب، قرآن کی ترغیبات اور آخر میں اس کے معاشرتی فوائد تفصیل سے بیان کیے جائیں گے۔

انفاق کا مفہوم، اقسام اور دائرہ

انفاق کا دائرہ صرف زکاۃ تک محدود نہیں۔ زکاۃ ایک مقرر نصاب پر فرض کردہ مالی عبادت ہے جس کے مصارف سورۃ التوبہ (آیت 60) میں بیان ہوئے ہیں، جبکہ انفاق اس سے وسیع تر تصور ہے جس میں صدقہ، خیرات، گھر والوں پر خرچ، مہمان نوازی، دینی و تعلیمی مقاصد پر خرچ اور عام فلاحی کام سب شامل ہیں۔ قرآنی آیات میں اہلِ ایمان کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اللہ کے عطا کیے گئے رزق سے خرچ کرتے ہیں (سورۃ البقرہ، آیت 3 کا مفہوم) اور یہ خرچ پوشیدہ بھی ہوتا ہے اور ظاہر بھی، دن میں بھی اور رات میں بھی (آیت 274 کا مفہوم)۔ انفاق کی شرط یہ ہے کہ مال حلال کمائی سے ہو، کیونکہ اللہ پاکیزہ ہی قبول فرماتا ہے، اور خرچ اسی جذبے سے ہو کہ مقصد اللہ کی رضا ہو نہ کہ شہرت اور بدلے کی توقع۔ سورۃ البقرہ کی مشہور تمثیل میں انفاق کرنے والے کی مثال اس دانے سے دی گئی ہے جس سے سات بالیں اگیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں (آیت 261 کا مفہوم)، یعنی خرچ کم نہیں ہوتا بلکہ اللہ کے ہاں کئی گنا بڑھتا ہے۔ یہ تمثیل انفاق کے اخروی پہلو کو واضح کرتی ہے کہ دیا ہوا مال ضائع نہیں جاتا۔

انفاق کی شرائط و آداب

قرآن نے انفاق کے آداب بھی تفصیل سے بیان کیے ہیں جن کے بغیر یہ عبادت بے روح ہو جاتی ہے۔ پہلا ادب اخلاص ہے کہ خرچ صرف اللہ کے لیے ہو، نمود و نمائش (ریا) اسے برباد کر دیتی ہے، جیسے اس شخص کی مثال دی گئی جس کی نیکی اس طرح برباد ہوتی ہے جیسے پتھر پر مٹی ہو اور تیز بارش اسے دھو ڈالے (سورۃ البقرہ، آیت 264 کا مفہوم)۔ دوسرا ادب یہ ہے کہ دینے کے بعد احسان نہ جتلایا جائے اور لینے والے کو اذیت نہ دی جائے، کیونکہ نرمی سے کہی گئی بات اور درگزر اس صدقے سے بہتر ہے جس کے پیچھے اذیت ہو (آیت 263 کا مفہوم)۔ تیسرا ادب یہ ہے کہ خرچ شدہ چیز پاکیزہ اور پسندیدہ ہو، ردی ناپسند اور ردے شدہ چیزیں اللہ کی راہ میں دینے سے منع کیا گیا ہے (آیت 267 کا مفہوم)۔ چوتھا ادب اعتدال ہے کہ نہ اسراف ہو نہ کنجوسی، خدا کے بندے نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل (سورۃ الفرقان، آیت 67 کا مفہوم)۔ پانچواں ادب یہ ہے کہ پہلے اپنے قریبی حق داروں، والدین، رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کو ترجیح دی جائے جیسا کہ سورۃ البقرہ (آیت 215) میں ترتیب کا مفہوم بیان ہوا ہے۔ ان آداب سے انفاق ایک مکمل اخلاقی تربیت بن جاتی ہے۔

انفاق کی ترغیب اور بخل کی مذمت

قرآن نے انفاق کی ترغیب محبت والی چیز خرچ کرنے کو اصل نیکی قرار دے کر دی ہے (سورۃ آلِ عمران، آیت 92 کا مفہوم کہ تم نیکی کو ہرگز نہ پہنچو گے جب تک اپنی پسندیدہ چیز سے خرچ نہ کرو)۔ اس کے مقابلے میں بخل کی سخت مذمت کی گئی ہے اور مال جمع کر کے گن گن رکھنے والوں کو وارننگ دی گئی ہے (سورۃ الھمزہ کا مفہوم)، اور جو لوگ سونا چاندی ذخیرہ کر کے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کے لیے عذاب کی خبر بھی سنائی گئی ہے (سورۃ التوبہ، آیت 34 کا مفہوم)۔ اس کی وجہ واضح ہے کہ بخل درحقیقت خود غرضی کی بدترین شکل ہے جو انسان کو سماجی ذمہ داری سے فرار کراتی ہے۔ انفاق کرنے والے کے لیے اللہ کی طرف سے اجر، گناہوں کی معافی اور دل کے سکون کی خوشخبریاں ہیں جبکہ کنجوس کے لیے تنگی اور بے چینی مقدر بنتی ہے۔ یہ ترغیب و تنبیہ اس لیے ہے کہ مال سے محبت انسانی فطرت میں گہری ہے اور اس محبت پر قابو پانا سب سے بڑی روحانی ریاضت ہے، اسی لیے انفاق کو جہادِ مال سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

جدول 1: انفاق کے نمایاں معاشرتی فوائد

وضاحت	فائدہ
مالدار سے محتاج تک مال کی منتقلی سے بنیادی ضروریات پوری ہوتی ہیں	غربت میں کمی
مال چند ہاتھوں میں مرتکز نہیں رہتا بلکہ بازار و معیشت متحرک رہتی ہے	دولت کی گردش
لینے دینے سے طبقاتی خلیج پٹتی اور دلوں میں الفت پیدا ہوتی ہے	محبت و بھائی چارہ
محرومی و بھوک سے پیدا ہونے والی چوری و فساد کی وجوہات کم ہوتی ہیں	جرائم میں کمی
یتیم خانے، تعلیم، علاج اور پانی جیسے فلاحی کام ممکن ہو جاتے ہیں	اجتماعی فلاح

USMAN NOTES www.usmannotes.com

معاشرتی فوائد (1): غربت کا خاتمہ اور دولت کی گردش

انفاق کا سب سے بڑا معاشرتی فائدہ غربت و محرومی کا خاتمہ ہے۔ ہر معاشرے میں بیمار، بوڑھے، یتیم، بیوہ اور بے روزگار افراد موجود رہتے ہیں جن کی کفالت کا بوجھ کوئی نہ کوئی اٹھانا ہی پڑتا ہے۔ قرآن نے انفاق کے نظام کے ذریعے یہ بوجھ معاشرے کے صاحبِ استطاعت افراد پر اخلاقی و دینی فریضے کے طور پر رکھ دیا، تاکہ محتاج عزتِ نفس کے ساتھ سہارا پائے۔ اسی سے جڑا دوسرا فائدہ دولت کی گردش ہے۔ قرآن کا اصول یہ ہے کہ مال صرف دولت مندوں ہی کے درمیان نہ گھومتا رہے (سورۃ الحشر، آیت 7 کا مفہوم)۔ جب دولت اوپر کے طبقے سے نیچے کے طبقے تک پہنچتی ہے تو بازار میں مانگ پیدا ہوتی ہے، چھوٹے کاروبار چلتے ہیں، روزگار بنتا ہے اور پوری معیشت متحرک ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس دولت کا ارتکاز معیشت کو مفلوج اور معاشرے کو طبقات میں بانٹ دیتا ہے۔ انفاق گویا معاشی عدل کا وہ عملی نظام ہے جو ریاست کے ٹیکس نظام سے پہلے انسان کے ضمیر سے کام لیتا ہے۔

معاشرتی فوائد (2): محبت، امن اور اخلاقی تربیت

انفاق کے سماجی فوائد صرف مالی نہیں، اخلاقی و نفسیاتی بھی ہیں۔ جب امیر غریب کی مدد کرتا ہے تو غریب کے دل سے امیر کے خلاف حسد و نفرت کم ہوتی ہے اور معاشرے میں بھائی چارہ پروان چڑھتا ہے، کیونکہ طبقاتی نفرت زیادہ تر اسی احساس سے جنم لیتی ہے کہ مالدار محتاج کو پوچھتا نہیں۔ یوں انفاق جرائم کی جڑ بھی کاٹتا ہے، کیونکہ بھوک اور محرومی انسان کو چوری، ڈکیتی اور بدامنی کی طرف دھکیلتی ہے جبکہ کفالت کا تعین نظام اس دباؤ کو کم کر دیتا ہے۔ دینے والے کی اپنی تربیت بھی اس عمل کا حصہ ہے: اس کے دل سے حرص نکلتی ہے، شکر اور قناعت پیدا ہوتی ہے اور مال کی محبت اللہ کی محبت کے تابع ہو جاتی ہے۔ معاشرتی سطح پر انفاق سے فلاحی ادارے قائم ہوتے ہیں، یتیموں کی کفالت، مریضوں کا علاج، طلبہ کی تعلیم اور پانی و راشن جیسی سہولتیں وجود میں آتی ہیں جن سے پورا سماج استحکام پاتا ہے۔ دورِ جدید میں زکاۃ و صدقات کے منظم ادارے، وقف کا نظام اور کمیونٹی فلاحی تنظیمیں اسی قرآنی تصور کی عملی شکلیں ہیں۔

خاتمہ

خلاصہ یہ ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ قرآن کا وہ جامع تصور ہے جو مال کو اللہ کی امانت مان کر اسے مخلوق کی خدمت میں لگانے کا نام ہے۔ اس کی بنیاد اخلاص پر ہے، اس کے آداب میں احسان نہ جتلانا، پاکیزہ مال دینا اور اعتدال رکھنا شامل ہے، اور اس کے فوائد غربت کے خاتمے، دولت کی گردش، طبقاتی ہم آہنگی، جرائم کی کمی اور اجتماعی فلاح تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جو معاشرہ انفاق کو اپنی ثقافت بنا لے وہ اقتصادی عدم توازن اور سماجی انتشار سے بڑی حد تک محفوظ رہتا ہے۔ طالب علم کے لیے عملی سبق یہ ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق باقاعدہ خرچ کی عادت اپنائے، چاہے مقدار تھوڑی کیوں نہ ہو، کیونکہ قرآن کے نزدیک انفاق کی قدر مال کی مقدار سے زیادہ دل کی کیفیت سے متعین ہوتی ہے۔ یہی تصور فرد کو بخل کی لعنت سے بچا کر سخی، ہمدرد اور ذمہ دار شہری بناتا ہے۔